صفدر رشید
پی ایچ-ڈی سکالر

نوآبادیاتی پس منظر میں ''ابن الوقت'' کا مطالعہ

Novel is grand text and can be interpretesd from many angles. It has the potential to absorb the spirit of its age. In this regard "Ibnul Waqt" by Nazir Ahmad is a representative novel. The article makes a Postcolonial study of "Ibnul Waqt". Postcolonial study widens our horizon to appreciate and interpret a text.

یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد سے جس انسان مرکز اور عقل پرست رویوں کے تحت ایک نئے دور کا آغاز ہوا اسے اصطلاحاً جدید یت (Modernity) کی تحریک کہتے ہیں۔ اس اصطلاح نے کافی انتشار پیدا کیا ہے اور مختلف بلکہ متضاد معنی میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ بیسویں صدی میں اس عقل پرستی اور حتمیت والے رویے کے خلاف یورپ ہی سے مختلف سطحوں پر آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں، اسے بھی جدیدیت کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں قسم کی جدیدیت متضاد عناصر کی حامل ہے، مگر اپنی روح میں چند باتوں کو چھوڑ کر یہ ایک ہی چیز ہے۔

ما بعد جدیدیت ایک دور کا عبوری نام ہے۔ اس دور کی شکل وصورت ابھی پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آئی۔ کم از کم اتنی بات تو طے ہے کہ یہ دور جدیدیت کے دور سے مختلف ضرور ہے اور جدیدیت کی بنیادی روح سے اس میں انحراف موجود ہے۔:

> '' جدیدیت نے مذہب کے بجائے عقلیت ، برادری کے بجائے انفرادیت ، روحانیت کے بجائے مادیت ، مابعد الطبعیات کے بجائے سائنس اور ترقی کو ترجیح دی جبکہ مابعد جدیدیت نے تاریخ اور سماجیاتی کے بجائے ثقافتی مطالعات کو زیادہ اہم قرار دیا''[1]

اس بدلے ہوئے دور میں مصنف کے بجائے قاری نے زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اب ٹیکسٹ کی بجائے کنٹکسٹ زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس طرح پوری تہذیب اور معاشرہ کا احاطہ ممکن ہوجاتا ہے۔ اس کا اطلاق صرف نئے متون پر ہی نہیں ہوا بلکہ ماضی کے متون کا مطالعہ بھی از سرنو انہی خطوط پر کیا گیا۔ اس ضمن میں سب سے اہم کام ایڈورڈ سعید کا ہے۔ ان کی دو کتابوں Orientalism (شرق شناسی) اور Culture and Imperialism (ثقافت اور سامراج) نے نئے مباحث کو جنم دیا۔

ایڈورڈ سعید کے مطابق نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں مخصوص حالات کے پیش نظر '' مشرق'' کا تصور ابھارا گیا۔ مشرق سے نہ سمجھ آنے والا حسن وابستہ کیا گیا۔ مشرق کو ایک معروض کے طور پر پیش کیا گیا جس کا مطالعہ درکار تھا۔ دانشورانہ سطح پر یہ کام زبان ، ادب ، تاریخ ، فلسفے ، غرض بہت سے شعبوں میں کیا گیا۔ مغرب نے اپنے لیے ایک '' دگر'' (Other) پیدا کیا۔ اس 'مشرقیت' کے ذریعے مغرب نے قوت اور شناخت حاصل کرنا چاہی ۔ اس طرح شرق پسندی درحقیقت '' دگر'' اور ''ہم'' کا تنازعہ ہے۔ جس کا عملی

اظہار نو آبادیوں کی صورت میں ہوا۔

اسی پس منظر میں ایڈورڈ سعید نے 'ثقافت اور سامراج' میں انگریزی ناول ، بالخصوص کانرڈ اور جین آسٹن کا مطالعہ کیا۔ ایڈورڈ سعید کے بقول ایک مخصوص ثقافت کو فروغ دینا اور دو مختلف ثقافتوں کو پروان چڑھانا سامراجی ایجنڈا ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ انگریزی ناول میں انگریزی اور'' دیگر'' ثقافت اتنے زور دار طریقے سے پیش کی گئی ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ سامراج اور انگریزی ناول میں بھی ربط تلاش کرتے ہیں۔

ایڈورڈ سعید کے بقول سامراجیت اور ناول کا گٹھ جوڑ پرانا ہے۔ ناول نے ثقافت کو ایک خاص رخ سے پیش کیا ہے۔ ناول نے نو آبادیت کے لیے راہ ہموار کی ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کیا۔ ناول کے بیانیے میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ محتاط انداز سے اخلاقی ، سیاسی ، اقتصادی سمت بندی کر سکے۔ اس لیے ڈکنز، تھیکرے ، جارج ایلیٹ ، کونرڈ ، جین آسٹن جیسے ناول نگاروں کے ہاں سمندر پار املاک، سستی مزدوری، گوروں اور سیاہ فاموں کی اقدار میں فرق، یورپ کی برتری اور ایشیاء اور افریقہ کی پستی جیسے موضوعات فطری انداز میں در آتے ہیں۔ ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> پہلی جنگ کے وقت برطانوی ایمپائر مطلق طور پر غالب آ گئی تھی اور یہ سولہویں صدی کے اواخر میں شروع ہونے والے عوامل کا نتیجہ تھا۔ یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ برطانیہ نے ناول کا رواج ڈالا اور اسے قائم رکھا۔ جس کا کوئی یورپی مقابل یا مساوی نہیں تھا۔ کم ازکم انیسویں صدی کے نصف اول میں فرانس کے پاس زیادہ ترقی یافتہ عقلی ادارے تھے ۔۔۔ اکیڈمیاں ، یونیورسٹیاں ، انسٹی ٹیوٹس ، جرائد وغیرہ۔۔۔ لیکن اس کمی کا ازالہ برطانوی ناول کے غلبے نے کر دیا۔[۲]

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء نے ہماری سیاسی تاریخ کو ہی نہیں بدلا بلکہ ہمارے شعور اور رویوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ نو آبادیاتی صورتحال وضع کی گئی اور ایسا محض عسکری قوت کے بل بوتے پر ممکن نہیں تھا۔ یہ صورت حال تشکیل شدہ تھی ، نوآباد کار اپنے مفادات کو طول دینے کے لیے بہت سے اقدامات کرتا ہے۔

نو آبادیاتی نظام 'ثنویت' پر قائم ہوتا ہے اور اس تقسیم کا اختیار نوآبادکار کے پاس ہوتا ہے۔ ایک کے اختیار میں اضافے کا مطلب دوسرے کے اختیار میں کمی ہوتا ہے۔ طرز زندگی مشاغل ، عمارات ، تفریح ، رہائش ، غرض ہر شے میں ثنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں :

> '' نو آباد کار اپنی شخصیت ، اپنی ثقافت ، اپنے علمی ورثے ، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آراء پھیلا تا ہے ، وہ نو آبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت ، ثقافت ،علم اور فنون کے متعلق موجود آرا ء کے متضاد اور انھیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں ۔''[۳]

مقامی باشندوں کے بارے میں ایک تصور خود ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ انھیں بتایا اور باور کرایا جاتا ہے کہ وہ کیا تھے اور کیا ہیں۔ علمی ، سیاسی ، ثقافتی غرض ہر طرح کی تاریخ کو خاص زاویے سے دکھایا جاتا ہے۔ نو آبادکار کی برتری ثابت ہونے کے بعد نو آبادیاتی نظام کو استحکام ملتا جاتا ہے۔ اس لیے رسمی اور غیر رسمی طور پر ایک ایجنڈے پر کام کیا جاتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج ہو یا انجمن پنجاب سب

نے مقامی باشندوں کے لیے ایک دنیا تشکیل دینے میں کردار ادا کیا۔علی گڑھ تحریک کو اس زاویے سے دیکھا جاسکتا ہے۔

یعنی ایک صورت' پیروی مغربی' کی ہے جس میں نو آبادکار کی ہر سطح اور ہر مقام پر برتری طے شدہ ہوتی ہے۔ بظاہر یہ گروہ عقل پرست دکھائی دیتا ہے۔مگر ذہنی مغلوبیت کے بعد خود مختار حیثیت قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔نو آبادکار اپنی اور مقامی زبانوں کی ترویج پر خاصا زور دیتے ہیں۔فورٹ ولیم کالج کی پالیسی میں مقامی زبانوں کی ترویج شامل تھی ۔ اس گروہ کا مقصد مشرق شناسی تھا لیکن کچھ عرصے بعد کمپنی میں دوسرا گروہ غالب آجاتا ہے جس کا نمائندہ لارڈ میکالے تھا۔اس نے مقامی زبانوں کے بجائے انگریزی کو فروغ دیا۔اس کے نزدیک اس پالیسی کے دو نتائج برآمد ہوں گے: ایک کاروبار حکومت کے لیے افراد تیار ہوں گے، دوسرا ایسے ہندوستانی پیدا ہوں گے جو اپنی سوچ اور رویوں میں انگریز ہوں گے۔ اس طرح معاشرے میں ثنویت کا دائرہ وسیع ہوجائے گا ۔ ظاہر ہے کہ اس پالیسی کے نتیجے میں کمپنی کو استحکام ملنا تھا۔مقامی باشندوں میں اس گروہ کی نمائندگی سرسید کر رہے تھے وہ لکھتے ہیں :

'' اگر ہم اپنی اصل ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں۔۔۔ ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہوجائے۔[۴]

اس عہد کی سب سے توانا شخصیت سرسید کی ہے۔ انہوں نے زبان ، ادب ، سیاست ، معاشرت ،تعلیم غرض ہر شے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق دیکھا اور وسیع تر انقلاب کے خواہاں تھے۔ انہوں نے جس طرح کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے تھے ، ادب میں آپ کا خواب محمد حسین آزاد اور حالی نے پورا کیا۔

حالؔی نے مقدمہ میں جس ادبی نظریہ سازی کو فروغ دیا اس میں بھی اُردو شاعری اور اس کی جانچ کے نئے معیار قائم کیے گئے اور باوجود اپنی مشرق پسندی کے شعوری اور غیر شعوری طور پر اسی ایجنڈے کے فروغ کا باعث بنے۔ اس طرح کلاسکی ورثے کے خلاف مہم اپنے ہی بزرگوں نے چلائی۔ بالآخر ایک ایسی فضا قائم ہوگئی جس کے نتیجے میں ایسے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہوئے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور کردار اور روح کے اعتبار سے برطانوی سامراج کا نوآبادیاتی ماڈل تھے۔' شریف زادہ' میں عابد حسین کا کردار ایک ایسے تعلیم یافتہ ہندوستانی کا ہے ۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں :

'' برطانوی سامراج نے ہندوستانیوں کے ذہن کو ایسے مغربی رنگ میں رنگنے کا خواب دیکھا تھا کہ ان کی اپنی روایت ان کے لیے بے وقعت اور نا قابلِ تقلید بن جائے۔''[۵]

مقامی باشندوں میں دوسرا رویہ بغاوت کا ہوتا ہے۔اس رویے کا سامنا کرنے کے لیے نو آبادکار پہلے سے ہی تیار ہوتے ہیں اور یہ تیاری محض قوت کے بل بوتے پر نہیں ہوتی بلکہ دور رس نتائج حاصل کرنے کے لیے گہری تعلیمی وثقافتی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ باغی گروہ مفاہمتی گروہ کی نسبت زیادہ دور اندیشی کا ثبوت دیتا ہے۔ باغی گروہ تہذیب کی ظاہری چکاچوند اور ترقی سے مرعوب نہیں ہوتا۔لیکن اس گروہ کا بھی ایک حصہ ظاہر پرست واقع ہوتا ہے اور نوآبادکار کی ہر شے سے نفرت کا اظہار کرتا ہے جیسا کہ نذیر احمد' ابن الوقت' کے آغاز ہی میں کہتے ہیں :

'' ابن الوقت [بطور کردار] کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی ہے کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جب کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا ۔۔۔ابن الوقت جیسے ملامتی نہیں تو اس کے

ہم خیال خال خال اور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اکا دکا دہلی کالج میں پڑھتے تھے۔ ان لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں آ نکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے تڑوا ڈالتے۔''[۶]

باغی گروہ کا دوسرا حصہ وسیع النظر تھا۔ وہ نو آبادکار کی تہذیب کے شعائر کو علامات کی شکل میں دیکھتا تھا۔ اس گروہ کے نمائندہ اکبرالہ آبادی ہیں۔

انجذابی اور باغی گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا نقطہ نظر بھی سامنے آتا ہے جو آفاقی ہے۔ نو آبادکار اور مقامی باشندوں کی دنیا میں، جو ثنویت پر قائم ہوتی ہیں، قدر مشترک تلاش کی جاتی ہے۔ آفاقی نقطہ نظر کو دراصل انجذابی نقطہ نظر کی ہی توسیع خیال کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ یہ نقطہ نظر برابری کی بنیاد پر قائم نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً جب سائنس کو کسوٹی مان کر مذہب کو پرکھا جائے تو برتری تو سائنس اور مادے کی ہی ثابت ہوئی۔ دونوں دنیاؤں میں اشتراکات تلاش کیے جاتے ہیں لیکن اس سب کے باجود مشرق مشرق رہتا ہے اور مغرب مغرب۔ سرسید دینیات اور ثقافت کے میدان میں اشتراکات تلاش کرنے کے باوجود بھی دونوں میں فرق اور افتراق کو کم نہیں کر سکے۔

ادھر ہندوستان میں غزل کے مقابلے پر نظم اور داستان کے مقابلے پر ناول کے لیے فضا ہموار کی گئی۔ نظم کے سلسلے میں سرسید، آزاد اور حالی کی کوششوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ نظم اور ناول میں یہ خوبی ہے کہ یہ دونوں مخصوص نقطہ نظر کے فروغ کے لیے بآسانی استعمال کی جاسکتی ہیں۔ ابوالکلام قاسمی تحریر کرتے ہیں کہ انگریز سرکار نے ناول کے فروغ کے لیے باقاعدہ ترغیب دی:

''ان [ڈپٹی نذیر احمد] کو ناول لکھنے کی تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے اعلان سے ملی۔ اس لیے جس حد تک ان سے ممکن تھا انھوں نے حکومت کے ضابطے کے مطابق اپنی تحریروں کو ڈھالنے کی کوشش کی۔''[۷]

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سماج حاکم اور محکوم اور کالے اور گورے میں تقسیم ہوا اور محکوم تقسیم در تقسیم ہوئے۔ کسی بھی قوم پر طاقت سے غلبہ حاصل کرنے کے بعد اقتدار میں استحکام اور طوالت پیدا کرنے کے لیے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی نوعیت کے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ ایک طرف مراعات یافتہ طبقے اور دوسری طرف تعلیمی نظام کی بدولت ہندوستان میں ایسے خاندان اور افراد بڑی تعداد میں وجود میں آ گئے تھے جو اپنی تہذیب و تاریخ سے شرمندہ تھے اور مغربی تہذیب و فکر سے مرعوب۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بہت سے اردو ناولوں کا موضوع مغربی تہذیب و فکر کے اثرات ہے۔ ان میں خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسوا، قرۃ العین حیدر اور عزیز احمد قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر مقالے میں ڈپٹی نذیر احمد کے ''ابن الوقت'' کا مطالعہ نو آبادیاتی پس منظر میں کیا جا رہا ہے۔

اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد کو ناول لکھنے کی تحریک حکومت کی طرف سے انعام دیے جانے کے بعد ملی، مگر ان کا معاملہ دیگر ''ارکان خمسہ'' سے جدا تھا۔ آپ کے ناولوں میں بظاہر دو متضاد باتیں یکجا ہیں۔ ایک یہ کہ آپ برطانوی راج کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت سمجھتے تھے اور دوسرا یہ کہ آپ مغربی تہذیب کو جزوی طور پر اپنی شرائط پر قبول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ثقافتی اور ادبی ورثے کے بارے میں آپ کا رویہ حالی اور آزاد سے مختلف تھا۔ آپ کے ناولوں میں مشرقی اور مغربی اقدار کی کشمکش دکھائی جاتی ہے اور یہ کہنا اتنا آسان نہیں ہوتا کہ آپ کا جھکاؤ کس طرف ہے، مثلاً ابتداء میں محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت مغربی فکر اور تمدن کے

سامنے پسپائی اختیار کر رہا ہے مگر آخر میں اس کی شخصیت کا کھوکھلا پن واضح ہوجاتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان معنوں میں نو آبادیاتی فکر کے آلہ کار نہیں بنے۔ مگر جب ہم نو آبادیاتی دور گزرنے کے بعد نذیر احمد کا جائزہ لیتے ہیں تو نو آبادیاتی فکر کی ترویج میں ان کا کردار واضح نظر آتا ہے۔ تاہم حالی اور آزاد کے برعکس آپ مغرب اور مشرق کی کشمکش کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔ اس دور کا ہندوستان فکری اور جذباتی سطح پر دو حصوں میں تقسیم ہورہا تھا۔ آپ کے ہاں دو طرح کے کردار واضح ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو بدلتی ہوئی صورتحال کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ اس گروہ کی نمائندگی کلیم، مبتلا اور سید ناظر کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ پرانی اقدار سے چمٹا ہوا ہے۔ اس کی نمائندگی نصوح، میر متقی اور حجۃ الاسلام کرتے ہیں۔ اس دور کے ہندوستان میں مغربی اور مشرقی اقدار میں تصادم کی صورت حال 'ابن الوقت' سے بہتر شائد ہی کہیں بیان کی گئی ہو۔ ناول کی پہلی ہی فصل سے اس تصادم کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قدرے طویل اقتباس پیش کیا جارہا ہے:

> ابن الوقت [بطور کرادر] کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جیسا کہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔۔۔ دہلی کالج ان دنوں بڑے زوروں پر تھا۔ ملکی لاٹ آئے اور تمام درسگاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے۔ قدر دانی ایسی ہو کہ جس جماعت میں جاتے، مدرس سے ہاتھ ملاتے، بڑے مولوی، صاحب نے طوعاً وکرہاً بادل نخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی مگر اس ہاتھ کو عضونجس کی طرح الگ تھلگ لیے رہے۔ لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ انگریزی صابن سے نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھو ڈالا۔۔۔ سرکار بہ منزلہ مہربان باپ کے تھی اور بھولی بھالی رعیت بجائے معصوم بچوں کے۔ انگریزی کا پڑھنا ہمارے بھائی بندوں کے لیے کچھ ایسا ناسزاوار ہوا جیسا آدم اور اس کی نسل کے حق میں گیہوں کا کھالینا۔۔۔ انگریزی زبان انگریزی وضع کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ اس غرض سے کہ انگریزیوں کے ساتھ لگاوٹ ہو مگر دیکھتے ہیں تو لگاوٹ کے عوض رکاوٹ ہے اور اختلاط کی جگہ نفرت، حاکم ومحکوم میں کشیدگی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دریا میں رہنا مگر مچھ سے بیر دیکھیں آخر کار یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔۔۔ انگریزی اخباروں میں جس کے ایڈیٹر انگریز ہیں بابوانہ انگریزی کی ہمیشہ خاک اڑائی جاتی ہے۔۔۔ ایک دوست ناقل تھے کہ ایک بار ان کو ایک انگریز سے ملنے کی ضرورت تھی۔۔۔ انھوں نے اپنے کانوں سے سنا کہ اندر بہت سے انگریز جمع ہیں اور ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ دوست یہ بھی کہنے لگے کہ جس انگریزی کی ہنسی ہورہی تھی بے شک وہ ہنسی کے قابل بھی تھی اور اہل زبان کو ہمیشہ دوسرے ملک والوں پر ہنسنے کا حق ہے۔ مگر ہندستانیوں کی انگریزی اگر ہنسنے کے قابل ہے تو اس کے مقابل میں انگریزوں کی اُردو رونے کے لائق۔۔۔ ساری ساری عمر ہندستانی سوسائٹی میں رہتے ہیں اور پھر بھی وہی ول کیا مانکٹا۔۔۔ انگریزی عمل داری نے ہماری دولت، ثروت، رسم ورواج لباس، وضع طور طریقہ، مذہب، تجارت، علم ہنر، شرافت سب چیزوں پر تو پانی پھیرا ہی تھا۔ ایک زبان تھی اب اس کا بھی یہ حال ہے کہ اوپر انگریزوں نے عجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی، غلط نامربوط اُردو بولنی شروع کی، ادھر ہر عیب کہ سلطان بہ پسند وہنراست ہمارے ہی بھائی بند لگے اس کی تقلید کرنے۔ ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی

خاصی ریش وبروت آغاز جوانی میں ولایت گئے ، چار پانچ برس ولایت رہ کر آئے تو ایسی سٹی بھولے کہ انگریزی اُردو میں بہ ضرورت کبھی بات کرتے تو رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں میچ میچ کر جیسے کوئی سوچ سوچ کر مغز سے بات اتارتا ہے۔[۸]

اس اقتباس سے درج ذیل نتائج بالکل سامنے کے ہیں :

الف۔ ۱۸۵۷ء میں سیاسی طور پر مغلوب ہونے کے بعد برصغیر میں مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف شدید ردعمل تھا اور اس ردعمل میں انتہا پسندی کا عنصر بھی موجود تھا۔ ایک انتہا پسندی نے دوسری انتہا پسندی کو جنم دیا۔ یہ ردعمل عوام اور خواص دونوں سطحوں پر موجود تھا۔ ابتداء میں مغربی تہذیب کی ظاہری علامتوں مثلاً لباس ،نشست وبرخاست اور دیگر طور طریقوں پر ہی شدید ردعمل تھا۔ انگریزی پڑھنا کفر تصور ہوتا تھا۔ انگریز سے کسی بھی نوعیت کا تعلق ناقابل برداشت تھا۔ اس ردعمل کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں سیاسی زوال کے ساتھ تہذیبی زوال اس درجے کا نہیں ہوا کیونکہ یہاں تہذیب اور مذہب کی جڑیں بہت مستحکم ہیں۔ اکبر الہ آبادی اس ردعمل کے نمائندہ ہیں۔ ایک دوسری سطح پر دیوبند کی تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے علی گڑھ تحریک کی ضد تھی۔ اس نے فکری سطح پر نو آبادیاتی عزائم سمجھ کر افراد سازی کا کام شروع کیا۔

ب۔ نذیر احمد اگرچہ برطانوی اقتدار کو ہندوستان کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں سمجھتے ، تاہم وہ ان کی ہر شے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جن مشرقی اور مغربی اقدار کا تصادم شروع ہوا تھا، نذیر احمد اس پر بے چین تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ طبقہ جو انگریزی وضع اختیار کر رہا تھا وہ بھی انگریزوں کے ہاں مقام حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

نذیر احمد ابھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے تھے کہ بالآخر اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ نذیر احمد، حالی ، آزاد اور اکبر الہ آبادی کا تعلق اس اولین نسل سے تھا جس کا انگریز سے ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی واسطہ پڑا تھا۔ اس لیے اس نسل اور بعد کی نسلوں کے ردعمل میں فرق ہے۔ اس ردعمل کے فرق کا جائزہ ایک علیحدہ مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔

ج۔ اُردو زبان کے بگاڑ کے قصے میں نذیر احمد کسی قسم کی رورعایت سے کام نہیں لیتے۔ کم از کم یہاں وہ برابری کی سطح پر آ کر بات کرتے ہیں۔ انگریزی عمل داری کے نتیجے میں ہندوستان کی دولت ، رسم ورواج ،تجارت ، مذہب علم وہنر میں گراوٹ کو کسی حد تک ایک لازمی برائی کے طور پر قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔مگر جہاں اُردو زبان کا معاملہ آتا ہے تو انگریزوں اور انگریز پرستوں پر چوٹ کرتے ہیں کہ اگر ہندوستانی انگریزی ٹھیک سے بول اور لکھ نہیں سکتے تو انگریزوں کی صورت حال اردو کے معاملے میں اور زیادہ خراب ہے۔ اسی طرح وہ ان لوگوں کو بھی ملامت کرتے ہیں جو 'مہذب' بننے کے شوق میں اپنی زبان بھی بھلا بیٹھے۔

ناول کی ساتویں فصل '' ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی'' ، میں ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر اپنی دکھ بھری داستان سناتے ہیں۔ وہ انگریزوں اور ان کے ہندوستانی عملے کے توہین آمیز برتاؤ کے شاکی ہیں۔ ذہن میں رہے کہ یہ صاحب انگریز سرکار کا حصہ ہیں اور ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ عام ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ ان کے عہدے کے باعث وہ انگریزوں سے قربت رکھتے ہیں، ان سے برابری کی

بنیاد پر برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام ہندوستانی اور کتے میں کیا فرق تھا: ''کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' ابن الوقت کے ایک عزیز جو ڈپٹی کلکٹر ہیں، افسران بالا سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔:

''اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صد ہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔۔۔ بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے، نیچی نظریں کیے ڈرتے ڈرتے، دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔۔۔ آخر نا چار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں؟ لوٹ چلیں، پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔۔۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے اسی طرح کھڑے سوکھا کیے۔۔۔ غرض بلائے گئے، صاحب کو دیکھا تو پائپ منھ میں لیے ٹہل رہے ہیں۔۔۔ سر جھکالے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کر ان کو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں۔ شائد جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔۔۔ آخر آپ ہی سر اٹھایا۔ ڈپٹی صاحب حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی، آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔۔۔ کہنے کو تو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹیکے ہوں تو جیسے چاہو قسم لے لو۔۔۔ کرسی پر بیٹھنا تھا کہ کم بخت چپڑاسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا، خداوند سرشتہ دار حاضر ہیں۔''[۹]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار میں اہم عہدوں پر فائز بہت سے افراد بھی ملازمت نیم دلی سے کر رہے تھے اور وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔ دوسرا یہ کہ حکمرانوں نے اپنے اور مراعات یافتہ طبقے کے بیچ بھی اتنا فاصلہ قائم کر رکھا تھا کہ قدم قدم پر انھیں حاکم اور محکوم میں تفریق سے سابقہ پڑا تھا۔ سرکاری عہدہ داران اور نوابین صاحب بہادر کے دربار میں سلام کے لیے حاضری دیتے اور گھنٹوں توہین آمیز انتظار کے بعد خوش قسمتی سے کبھی دیدار نصیب ہوتا اور سلام قبول ہوتا اور بعض اوقات تو چپراسی کی معرفت کہلوا دیا جاتا کہ سلام قبول ہے، اب تشریف لے جایئے۔

ایسے ہندوستانی افسران کا باہر کی دنیا میں بہت رعب ودبدبہ تھا حالانکہ یہ وہ افسران تھے جن کو حکام بالا کے اردلی بھی خاطر میں نہ لاتے تھے کیونکہ وہ ان کی اصلیت سے آگاہ تھے۔

مستشرقین کے انفرادی کام اور اداروں کے قیام کی بدولت ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہندوستانی ذہن پر یورپ کی برتری ثابت ہوچکی تھی۔ مقامی باشندوں کو ذہنی طور پر مغلوب کیے بغیر امپیریل ایجنڈا کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حتیٰ کہ یہ ثابت کر دیا گیا کہ ہم اپنی زبان، ثقافت اور تاریخ کی تفہیم کے لیے ان کے رحم وکرم پر ہیں۔ ایک مرتبہ یہ چیز ذہن میں بیٹھنے کے بعد ہم ہر اس تصور اور نظریے کو ایک نعمت سمجھیں گے جو مغرب سے آئے۔ نوبل صاحب بہت گہرے آدمی ہیں۔ انھوں نے جنگ آزادی کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ ہندوستانی مزاج کے آشنا ہیں۔ امن قائم ہونے کے بعد دور اندیش نوبل صاحب نے مسلمانوں کی ''تربیت'' کے لیے ابن الوقت کو بطور ایک مصلح دیکھا۔ وہ ابن الوقت کو مصلح کا کردار ادا کرنے کے لیے قائل کرتے ہیں اور جن دلائل سے کام لیتے ہیں

وہ حسب ذیل ہیں:

آپ کو یورپ جانے کا اتفاق نہیں ہوالیکن اگر آپ گئے ہوتے تو آپ پرثابت ہوجاتا کہ اہل یورپ کی عظمت سلطنت میں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اورتار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی بکارآمد کلیں بنا ڈالی ہیں ۔۔۔ ہندوستانیوں کے پنپنے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہی کہ ان میں علومِ جدید کو پھیلایا جائے اور ان کواس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں۔۔۔ تمام علوم جدیدہ جن پر ملّی ترقی کا انحصار ہے انگریزی میں ہیں۔ سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا۔۔۔اس کے علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک غرض تو علوم جدیدہ کا پھیلاؤ ہے اور دوسری غرض اور بھی ہے یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا اکیلے علوم جدیدہ سے کام چلنے والانہیں ۔ جب تک خیالات میں آزادی، ارادے میں استقلال ، حوصلے میں وسعت ، ہمت میں غلو، دل میں فیاضی اور ہمداردی ، بات میں سچائی، معاملات میں راست بازی یعنی انسان پورا پورا جنٹلمین نہ ہو اور وہ بدون انگریزی جاننے کے نہیں ہوسکتا۔ انگریزی دان آدمی کو اخباروں اور کتابوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات پر آگہی بہم پہنچانے کے بڑی آسانی ہوسکتی ہے ۔ رفارم جس کی ضرورت ہندوستان کو ترقی کے لیے ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریز بنایا جائے۔ خوراک میں ، پوشاک میں ، زبان میں ، عادات میں ،طرز تمدن میں ، خیالات میں ہر ایک چیز میں اور وقت اس کے لیے چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے مگر اس کی کوشش دھیمی ہے اور اس پر نتیجے کا مرتب ہونا دیر طلب ، لوگوں کے دلوں میں خود بخود اس طرح کے خیالات بہ تقاضا ئے وقت پیدا ہوچلے ہیں ۔ کوئی رفارمر کھڑا ہوکر اس جلتی ہوئی آگ کو جلد سے بھڑکا دے۔[۱۰]

نوبل صاحب ایسے اقدامات کرنے کے خواہاں ہیں جن سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کو طوالت اور استحکام نصیب ہو۔ وہ لارڈ میکالے کے پیروکار نظر آتے ہیں ، دوررس نتائج کے حصول کے لیے انگریزی زبان اور تہذیب کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ بات ایک تحریک کی شکل اختیار کرے اور یہ تحریک خود ہندوستانیوں کے اندر سے اٹھے۔ نوبل صاحب کے عزائم وہ امپریل ایجنڈا ہے جو نوآبادکاروں نے رفتہ رفتہ مختلف ذرائع کے ذریعے سے پھیلایا۔

اور یہ بات واضح ہے کہ اس آئیڈیالوجیکل ادارے کے بغیر طاقت کے بل بوتے پر حاصل کردہ نتائج کو زیادہ عرصہ قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ نوبل صاحب جس قسم کے 'جنٹلمین' کو وجود میں لانا چاہتے ہیں حالی اور آزاد بھی اس کوشش میں ان کے ہم نوا ہیں اور یہ وہی 'جنٹلمین' ہے جو ہادی رسوا نے عابد حسین کی شکل میں تخلیق کیا ہے۔ یعنی مغرب کی ریل کے سامنے بالکل بچھ گئے اور کلیں دیکھ کر اوسان خطا ہو گئے۔ نوبل صاحب کے بقول انگریزی زبان اور خیالات کے پھیلنے سے جو جنٹلمین وجود میں آئے گا وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل ہوگا: (i) آزاد خیال ہوگا (ii) پختہ ارادے کا مالک ہوگا (iii) عالی حوصلہ ہوگا (iv) باہمت ہوگا ،(v) فیاض ہوگا ، (vi) ہمدرد اور سچا ہوگا (vii) معاملات میں صاف ہوگا۔ اور یہ وہ حقائق ہیں جو انسان میں انگریزی جانے بغیر پیدا ہونا محال ہے۔ نوبل صاحب کہتے ہیں کہ وقت اس طرح کے 'جنٹلمین' کے ظہور کے لیے بے تاب ہے اور' چپکے چپکے کوشش کر رہا ہے' نوبل

صاحب اچھی طرح سمجھتے ہیں ، اگر چہ ابن الوقت نہیں سمجھتے ، کہ یہ 'چپکے چپکے کوشش' کتنے عرصے سے ہورہی تھی۔ یہ کوشش ، دراصل سامراجی ایجنڈا ہے اور جس کے لیے رسمی اور غیر رسمی ادارے بھی وجود میں آئے اور بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ یہ اسی کوشش کا ہی ثمر ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں بھی جدید نو آبادیاتی دور میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے وہ اکابر جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ امپیریل ایجنڈے کو فروغ دیا ، ہم ان کے اخلاص پر شک نہیں کر سکتے۔ اس دور کے معروضی حالات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مختلف ردعمل سامنے آئے اور مختلف حکمت عملیاں وضع کی گئیں جن میں سے ایک حکمت عملی علی گڑھ کی تحریک کی صورت میں یہ بھی تھی۔

ناول کی نویں فصل میں ابن الوقت کی تبدیلی وضع کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ نوبل صاحب کا ایک ملازم جاں نثار، تبدیلی وضع کے سلسلے میں ابن الوقت کو قیمتی مشوروں سے نوازتا ہے۔ امکان ہے کہ ایسا کرنے کو خود نوبل صاحب نے کہا ہے۔ جاں نثار اسم بامسمی ہے۔ ہروقت انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اس کے بقول انگریزوں کے بُرے بھی ہمارے اچھوں سے اچھے اور بہت اچھے ہیں۔ ابن الوقت رفارمر بننے کے لیے رضا مند ہوگئے ہیں ، لیکن جاں نثار کا مشورہ ہے کہ حلیہ بھی بدلا جائے تا کہ انگریزوں کی ان سے اجنبیت ختم ہو۔ اس موقع پر جاں نثار اور ابن الوقت میں اہم مکالموں بھی خالی از دلچسپی نہیں۔

نذیر احمد خود اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اہم بات کہتے ہیں کہ اس میں نوبل صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ابن الوقت میں اپنی قوم اور قوم کی ہر چیز کی حقارت اور انگریز اور ان کی ہر بات کی وقعت پہلے سے اس کے ذہن میں مرتکز تھی۔ مراد یہ کہ رفارمر کا کردار ادا کرنے کے لیے ابن الوقت کا انتخاب خواہ مخواہ نہیں کیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُس کے دل میں اپنی قوم کی حقارت اور انگریز کی عظمت کس طرح بیٹھ گئی۔ یہ وہی 'چپکے چپکے کی کوشش' تھی۔ وہ جوان تھا اور یہ وہ نسل تھی جس پر انگریزی تعلیم اور تہذیب کا جادو اپنا رنگ دکھا چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ظاہری وضع قطع میں تبدیلی سے انگریز اسے اپنی سوسائٹی میں قبول کرلیں گے ، مگر کچھ عرصے بعد اس کی یہ بات خام خیالی ثابت ہوتی ہے۔ ابن الوقت اپنی پوری توانائیاں انگریزی آدابِ معاشرت سیکھنے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ کوّے کی طرح ہنس کی چال چل رہے تھے۔ اگر چہ نذیر احمد کی ہمدردیاں ابن الوقت کے ساتھ ہیں مگر یہاں وہ اسے بطور مضحکہ خیز کردار پیش کرتے ہیں :

> '' ابن الوقت نے آئینے میں دیکھا تو اپنے تئیں انگریزوں کے ساتھ پایا۔ بے اختیار تن کر کپڑے بدلنے کے کمرے میں لگا پینترے بدلنے۔۔۔ جاگا تو ہوا خوری کے کپڑے بدل باہر نکل گیا ۔۔۔ ڈنر کے بعد تیاری شروع ہوئی ، کچہری نہیں ، دربار نہیں ، کوئی پارٹی نہیں ، اس پر بھی دن کے گیارہ بجے سے لے کر اب یہ تیسری دفعہ ہے کہ انگریزی تہذیب کپڑے بدلنے کی متقاضی ہے ۔''[۱۱]

ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے کے بعد نوبل صاحب ان کے اعزاز میں کھانا دیتے ہیں جس میں بڑی تعداد میں انگریز مدعو ہیں۔ یہاں ابن الوقت کو بطور رفامر متعارف کروانا مقصود تھا۔ کھانے کے بعد ابن الوقت ایک طویل تقریر کرتے ہیں جس کے چند نکات اہم ہیں :

غرض ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا یہ نتیجہ ضرور ظاہر ہوا ہے کہ ایک دوسرے سے وحشت باقی نہیں رہی۔۔۔ اور پھر بھی میں اس کو اتحاد کے درجے میں نہیں سمجھتا۔ دونوں کے دل بدستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں ۔ آج کوئی بھڑکانے والا کھڑا ہو تو مسلمانوں کے نزدیک ہندو ویسے ہی کافر اور مشرک ہیں اور ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ویسے ہتیارے بھرشٹ اور یہ نااتفاقی گورنمنٹ کے حق میں ایک فال مبارک اور شگون نیک ہے مگر وہیں تک کہ باہم رعایا میں ہو۔[۱۲]

وہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں کبھی بھی لڑایا جاسکتا ہے اور رعایا کی اس نااتفاقی کو انگریزی حکومت کے لیے نیک شگون گردانتے ہیں۔ یہ بات بہت معنی خیز ہے ۔ابن الوقت ' لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کا عندیہ دے رہے ہیں۔ یہاں وہ صحیح معنوں میں امپریل ایجنڈے کا آلہ کار دکھائی دیتے ہیں۔ممکن ہے کہ وہ موقع محل کی مناسبت سے انگریزوں کے دل کی بات کر رہے ہوں۔مگر ایک ہندوستانی کی زبان سے ایسی بات کا نکلنا باعث شرم ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کو بڑھانا اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنا برطانوی حکومت کی حکمت عملی کا تقاضا تھا۔ یہ وہی ہندوستان تھا جہاں مسلمانوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود سینکڑوں برس حکومت کی اور اب اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ یہ تفریق پیدا کرنے میں ، خاص طور پر لسانی سطح پر ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج جیسے اداروں کا بھی کردار ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد برطانوی سرکار کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا ، لہٰذا لسانی ، مذہبی اور ثقافتی سطح پر ان میں موجود فرق کو مزید پاٹا گیا جس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔

نذیر احمد ابن الوقت میں ہونے والی ظاہری، ذہنی اور قلبی تبدیلیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں ۔ تیرہویں فصل کا عنوان ہے : '' انگریزی وضع کے ساتھ اسلام کا نبھنا مشکل ہے۔'' نذیر احمد شعائر اسلامی کی اہمیت دل وجان سے جانتے تھے۔ اس فصل میں وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح انگریزی وضع اور طور طریقے اپنا رنگ دکھانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اکبر نے کہی تھی کہ :

؎ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے[۱۳]

نذیر احمد انگریزی وضع اور طور اطوار کو اسلام کی ضد گردانتے ہیں کہ دونوں کو ایک ساتھ نہیں چلایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں ابن الوقت انگریزی معاشرت کا حصہ بنتے گئے توں توں وہ مذہب سے دور ہوتے گئے ۔ یقیناً اس کا ایک پہلو خود ابن الوقت کے کردار کی کمزوری بھی ہے لیکن تنہا فرد پر معاشرت بالآخر غلبہ پا ہی لیتی ہے، جیسا کہ ہوا:

'' پھر اکثر اتفاق پیش آجاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیویٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آنکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے آگھیرا ہے۔ ان کو چھوڑ کر جانہیں سکتے یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا کیوں مسٹر ابن الوقت ؟ ہوا خوری کو چلتے ہو یا چلو ذرا بلیرڈ کھیلیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے اور

نماز کا انتظام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے۔۔۔غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی۔ پھر نوافل ، پھر سنن جا کر نرے فرض رہے۔۔۔ پھر جمع بین العصرین والمغر بین شروع ہوا پھر قضائے فائتہ پھر بالکل چٹ ۔کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہیں تھا۔ ابن الوقت کو انگریزوں کے پرچانے کی پڑی تھی اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے ۔[۱۴]

انسان پر تعلیم ،صحبت اور معاشرت کے اثرات کسی نہ کسی طور حاوی ہو کر ہی رہتے ہیں۔ اسی لیے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی انگریزی زبان ،تعلیم اور معاشرت کے پھیلاؤ کی منظّم کوششیں سامنے آچکی تھیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کوششوں میں تیزی آ گئی اور اعتماد بڑھ گیا۔ اس ضمن میں سب سے کامیاب تحریک علی گڑھ کی تھی جو تعلیم، مذہب اور معاشرت کو محیط تھی ۔''ارکان خمسہ'' کسی نہ کسی طور اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ ایسا نہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی ہم ابن الوقت پر قیاس کریں۔ یہ تمام افراد اپنی وضع اور اطوار میں خالص ہندوستانی تھے اور ہر تحریک کی طرح یہ تحریک بھی اپنے اندر مثبت اور منفی رجحانات لیے ہوئے تھی۔

ابن الوقت کی نئی وضع اور جدید خیالات کو معاشرے میں پذیرائی نہ مل سکی۔ انھیں جگہ جگہ خفت اٹھانا پڑی ، آہستہ آہستہ انگریز بھی ان سے بدظن ہوتے گئے۔ ناول کے ایک اور کردار حجتہ الاسلام کا جائزہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ۔ ابتداء میں محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت کے پردے میں نذیر احمد بول رہے ہیں۔مگر بہت جلد وہ نذیر احمد کے طنز کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔ حجتہ الاسلام کو ابن الوقت کی طرزِ زندگی اور خیالات پر سخت اعتراضات ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس میں بھی شبہ نہیں کہ انگریز سرکار ہندوستان کے لیے ایک نعمت ہے۔ انھیں نذیر احمد کا نمائندہ (Mouth Piece) کہا جاسکتا ہے۔ اس ناول کو ایک ایسی دستاویز کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد کا ابتدائی دور محفوظ ہوگیا ہے۔ نو آبادکاروں کے عزائم اور مقامی باشندوں کا مختلف طرح کا ردِعمل اس میں موجود ہے۔ ہندوستان پر مغربی تعلیم اور تہذیب کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔حاکم اور محکوم کا تعلق کس نوعیت کا ہوگا اور مقامی باشندوں کی آپس کی گروہ بندیاں کیا صورت اختیار کریں گی؟ یہ اور اس طرح کے سوالات پیدا ہو چکے تھے لیکن جواب بعد کے دور میں ملے۔ناول کے جائزے کو ابوالاکلام قاسمی کی اس رائے پر ختم کیا جاتا ہے :

> اس ناول میں ابن الوقت کا کیریکٹر تمسخر کا انداز اختیار کرنے کے باعث نو آبادیاتی فکر کے معاملے میں نذیر احمد کے تحفظات کو نمایاں کرتا ہے ۔ اس طرح اپنے بعض دوسرے ناولوں میں بھی نذیر احمد نو آبادیاتی فکر سے کبھی مغلوب ہونے اور کبھی مزاحمت کا انداز اختیا رکرنے کا تاثر دیتے ہیں ،مگر جب وہ ہندوؤں کے مقابلے میں برطانوی سامراج کو ترجیحی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ان کا یہ خوف ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ صدیوں سے حکمرانی کرنے والا مسلمان اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں اس پر ہندو حکمران نہ ہوجائے اس لیے اہل کتاب کی حکمرانی ان کو بسا غنیمت اور خدا کی رحمت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو کہ نو آبادیاتی فکر جزوی طور پر سہی قبول کرنے اور فروغ دینے کے معاملے میں نذیر احمد کا رول بھی خاص غور طلب ہے۔[۱۵]

حوالہ جات

۱۔ دیوندر اسر، نئی صدی اور ادب، کرشن نگر، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۵

۲۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، یاسر جواد (مترجم) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۱

۳۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، نوآبادیاتی صورتحال مشمولہ لسانیات اور تنقید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴

۴۔ سرسید احمد خان، خطوط سرسید احمد خان، مشتاق حسین (مرتب) ۱۹۶۰ء، ص ۱۸۔۱۷

۵۔ قاسمی، ابوالکلام، نوآبادیاتی، نوآبادیاتی فکر اور اُردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدیت ۔ اطلاقی جہات، ناصر عباس نیّر (مرتب)، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۸، ص ۱۹۷

۶۔ نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۵

۷۔ قاسمی ابوالکلام، نوآبادیاتی فکر اور اُردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدیت ۔اطلاقی جہات ص ۱۹۶ء

۸۔ نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۹۔۵

۹۔ ایضاً، ص ۴۹۔۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۱۔۵۸

۱۱۔ ایضاً ص ۷۰

۱۲۔ ایضاً ص ۹۰۔۸۴

۱۳۔ اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر الہ آبادی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۷۸

۱۴۔ نذیر احمد، ڈپٹی، ابن الوقت، ص ۱۰۹

۱۵۔ قاسمی، ابوالکلام، نوآبادیاتی فکر اور اُردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی مشمولہ مابعد جدیدیت ۔ اطلاقی جہات، ص ۱۹۷۔۱۹۶